اقبال کی اردو شاعری

ماہر القادری

تعقل و تدبر اور غور و فکر کے ساتھ ہی ''فلسفہ،، کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے علم فلسفہ کا ایک صفحہ بھی نہ پڑھا ہو اور اس فن کی ابجد سے بھی ناواقف ہو، مگر اس کے سوچنے کا انداز فلسفیانہ ہو۔ ایک عامی بھی جب اس طرح سوچتا ہے کہ یہ دنیا کس لئے بنائی گئی ہے، انسان کے پیدا کئے جانے کا کیا مقصد ہے؟ دنیا کا کارخانہ کس کے حکم سے گردش کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟—تو ''کیوں،، ''کس لئے،، ''چون و چرا،، اور ("How" and "Why") کا تصور آتے ہی غیر شعوری طور پر فلسفیانہ مقدمات اور قضایا مرتب ہونے لگتے ہیں۔ فلسفہ کی اس ہمہ گیری کو ارسطو نے اسطرح ظاہر کیا ہے :—

''ہم فلسفیانہ انداز پر غور و فکر کرنا چاہیں یا نہ چاہیں،
مگر ہمیں فلسفیانہ طرز پر غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے۔،،

ایک بچہ جب اپنی ماں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھتا ہے کہ فلاں چیز کس لئے بنائی گئی ہے، تو فلسفیانہ زبان میں اس بچے کے اس استفسار کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ماں سے اس شے کی ''علت غائی،، دریافت کر رہا ہے! غور کرنے، سوچنے اور دریافت کرنے کے یہی سادہ فطری تصورات ہیں جو فلسفہ کی کارگہ میں پہنچ کر نازک، دقیق اور غامض اور پیچیدہ بنتے چلے گئے ہیں بلکہ مرعوب کن اور حیرت انگیز بھی! فلسفہ ایک عالم حیرت اور دنیائے گوناگو بھی ہے، بزم لطائف و ظرائف بھی ہے، اور جہان حقائق و واقعات بھی ہے! اشراقیت ہو یا مشائیت، سفسطائیت ہو یا ارتیابیت لذتیت ہو یا اور کوئی ''ازم،، (ISM) یہ سب فلسفہ ہی کے آذرکدہ کے تراشے ہوئے صنم اور اسی لیبارٹری کے ''مرکبات،، و ''محلولات،، ہیں—

کوئی شک نہیں فلسفہ بعض اوقات ''خلا،، میں بھی بولتا اور حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور اس کی اس ''ماورائیت،، کا انسانوں کے عمل و تجربہ

سے مشکل ھی سے پیوند جوڑا جا سکتا ھے۔ فلسفہ کی اس ''رھبانیت،، اور ''مجذوبیت،، نے استعاروں اور اصطلاحوں کے طلسم کھڑے کر دئے ھیں، مگر اس سے انسانیت کو حیرت و ژولیدگی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ شاید سسرو (Cicero) نے فلسفہ کے اسی رخ کو دیکھ کر کہا تھا۔

''کوئی بیکار اور لایعنی شے ایسی نہیں، جو فلسفیوں کی کتابوں میں نہ ملتی ھو،،

لیکن انصاف کی بات یہ ھے کہ عام طور پر فلسفہ کا تعلق انسانی ذھن و فکر کی ''ورائیت،، ھی سے رھا ھے، اور کہیں کہیں تو یہ محسوس ھوتا ھے کہ فلسفہ ھماری فطرت کی آواز ھے، یا یوں کہئے کہ ان جرعوں کے لئے ھماری فطرت تشنگی محسوس کر رھی تھی۔ پھر فلسفۂ جدید و قدیم میں ربط بھی پایا جاتا ھے۔ ارسطو کے یہاں جسے ''فلسفۂ اولیٰ،، کہا جاتا تھا، اسے ھمارے زمانہ میں ''ما بعد الطبیعات،، کہتے ھیں۔

اس تصویر کے دونوں رخ یہ ھیں کہ فلسفہ نے مسائل کی گرھیں بھی کھولی ھیں اور الجھنیں بھی ڈالی ھیں۔ یہ کہیں آب حیات ھے اور کہیں زھر ھلاھل — یہ تو اپنی اپنی یافت اور اپنا اپنا ظرف و ذوق ھے کہ فلسفہ نے کسی کو لاادریت اور تشکیک و نفی اور بے یقینی کی بھول بھلیوں میں لا کر چھوڑ دیا اور کسی کو یقین و ایمان کی حدوں تک پہونچا دیا۔ مولانا رومی کی طرح علامہ اقبال کو بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے فلسفہ نے الجھایا اور ڈگمگایا نہیں! اقبال کو حیرت فارابی اور پیچ و تاب رازی کی منزلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ اور کیا عجب ھے کہ بو علی سینا کی طرح اقبال کو بھی ''غبار ناقہ،، سے واسطہ پڑا ھو۔ مگر کسی مقام پر اقبال کا قافلہ فکر و نظر ٹھیرا نہیں۔ اقبال نے تعقل و تفلسف کے ھر ڈوبتے ستارے کو دیکھ کر ''لا احب الآفلین،، کہا اور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کا شعور پکار اٹھا۔

خودی کا سر نہاں، لا الہ الااللہ — خودی ھے تیغ، فساں لاالہ الااللہ
یہ دور اپنے براھیم کی تلاش میں ھے — صنم کدہ ھے جہاں، لاالہ الااللہ

اقبال کے مزاج و فطرت کی استقامت کی سب سے بڑی دلیل یہ ھے کہ لوگ فلسفہ اور مغربی علوم کے دو چار جام پی کر بہک جاتے ھیں، لیکن اقبال

اسکے سمندر نوش کرکے بھی غیر متوازن نہیں ہونے پاتا۔ اس ظرف اور مزاج کے لوگ دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کے مزاج و فطرت اور فکر و رجحان کی یہی خصوصیت ہے، جو اس کی شاعری میں ''زمانہ ستیز،، اور ''کم آمیز،، بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ لفظی ترکیبیں اپنی معنویت کے اعتبار سے اقبال کی فطرت کی ترجمان و عکاس ہیں! اقبال نے زمانہ کی غلط کاریوں اور غلط اندیشیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے، بلکہ ان سے جنگ کی۔ مغربی فکر و تہذیب کے ان بتوں پر ضربیں لگائیں۔ اقبال کی ''ضرب کلیم،، نہ صرف یہ کہ اعلان جنگ بلکہ مغرب زدگی اور مادہ پرستی سے دست بدست جنگ ہے!

اقبال مفکر تھا، فلسفی تھا، مگر کیسا فلسفی —— جس نے فلسفہ کی چٹانوں کو تراش کر ان پر شعر و ادب کی میناکاری کی، بلکہ انھیں گل بوٹوں کی صورت دے دی۔ شیشہ و سنگ کا یہی امتزاج اقبال کا فن ہے، اور اس مقام پر وہ دوسرے شاعروں سے منفرد نظر آتا ہے۔ خاقانی شروانی کتنا عظیم شاعر ہے، ''خلاق معانی،، کا لقب اسے زیب دیتا ہے۔ فلسفہ اور کلام و منطق سے اس نے اپنی شاعری میں کام لیا ہے۔ مگر اس کے نہ جانے کتنے اشعار چیستاں اور معمہ بن کر رہ گئے ہیں، جن کے سمجھنے میں ذہن و فکر کو بڑی ورزش کرنی پڑتی ہے! اقبال نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ اصطلاحات سے کام نہیں لیا۔ اور یہ دلیل ہے اس کے شاعرانہ مزاج کی لطافت کی—— کہ فلسفیانہ اصطلاحات سے شاعری بوجھل ہوجاتی ہے! اقبال کے شاعرانہ فن کا یہ کمال ہے کہ اس نے فلسفہ کی سنجیدگی اور خشکی کو رعنائی و رنگینی سے بدل دیا۔ بلند سے بلند خیال، عمیق سے عمیق تر فکر اور نازک سے نازک مفہوم کو پیش کیا، مگر اس حسن و خوبی کے ساتھ کہ خیال کی بلندی کو عام ذہن و فکر چھو سکیں، فکر کی گہرائی تک دماغ پہنچ سکیں، اور مفہوم کی نزاکت سمجھ میں آسکے: ابہام اور ژولیدگی شعر و سخن کا حسن نہیں عیب اور نقص ہے، اقبال کا فن اس عیب سے پاک ہے، اس کے یہاں سلجھاؤ ہے، دل نشینی ہے، لطف بیان ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاثیر ہے۔ اشعار ہیں کہ نشتر بن کر دلوں میں اترے جاتے ہیں، ''از دل خیزد بر دل ریزد،، کا صحیح مصداق!

شعر میں تاثیر قافیہ پیمائی اور لفظوں کے جوڑ دینے سے پیدا نہیں ہوتی، جذب دل اور سوز جگر اس کمال کو وجود میں لاتے ہیں۔ جو انگیٹھی خود ہی گرم نہ ہوگی، وہ اپنے ماحول کو کسطرح گرم کر سکتی ہے؟ اقبال کے دل کے سوز و تپش نے اس کے فن میں گرمی اور تازگی پیدا کی ہے؟ پھر خیال و اظہار

(Idea & expression) کو مربوط اور ہم آہنگ بنانے کا کسی کو سلیقہ نہ ہو، تو دل کا سوز بھی اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ بلکہ خیال و اظہار کی بے ربطی سوز دل کی تاثیر کو مجروح بنا دیتی ہے۔ اقبال خیال و اظہار کو مربوط اور ہم آہنگ بنانے میں سلیقہ ہی نہیں کمال رکھتا ہے، اور کمال بھی معجز نما! فنکار کا لفظ اس قدر عام اور سطحی ہو گیا ہے کہ اقبال کو فنکار کہتے ہوئے بھی طبیعت جھجھکتی اور رکتی ہے، اقبال فنکار نہیں ''خلاق فن،، ہے، اسی لئے اس کی شاعری میں ابداع ہے، جدت ہے، نیا پن اور تازگی ہے، جہاں وہ دوسرے مفکرین سے متاثر ہوا ہے وہاں بھی پیرایہ بیان اور طرز ادا نے اس تقلید و تاثر کو اچھوتا بنا دیا ہے۔ مثلاً مولانا روم نے عشق کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے—

اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اور
عشق اصطرلاب اسرار خدا

اقبال پیر رومی کے ان افکار سے متاثر ہو کر کہتا ہے—

عشق با نان جویں خیبر کشاد
اور
صدق خلیل بھی ہے عشق، عزم حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

کوئی شک نہیں اس چشمہ کا منبع پیر رومی کے افکار ہیں، مگر پیرایہ بیان اور طرز ادا نے اس کو کس قدر منفرد بنا دیا۔ جیسے یہ چشمہ فوارے کی طرح خود ہی زمین کی تہوں کو توڑ کر ابل پڑتا ہے۔ عشق کے ''اصطرلاب اسرار خدا،، ہونے میں کوئی شک نہیں بڑی پاکیزگی پائی جاتی ہے، اور اس میں عرفان و بصیرت اور تزکیہ و مراقبہ کی چاشنی ملتی ہے، لیکن جس عشق نے نان جویں کھا کر خیبر شکنی کی ہو، اس کی ولولہ انگیزی اور قوت عمل کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے! اور جو عشق بدر و حنین بن کر ظاہر ہوا ہو، اس کی معرکہ آرائی اور تقدیس کردار و عمل کا کیا پوچھنا!

رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری میں روحانیت کی خاصی جھلک ملتی ہے، مگر

یہ روحانیت ایک خیالی دنیا (Utopian World) کی روحانیت ہے، کہ بس سوچتے ہی رہیئے، یہاں تک کہ شاعر کے افکار میں گم ہوکر رہ جائیے، مگر اقبال کی شاعری میں روحانیت کی نمود ایک عملی دنیا کی روحانیت ہے جس کو زندگی میں برتا جا سکتا ہے۔ جہاں انسانی افکار و جذبات کو عمل کے لئے ابھارا جاتا ہے۔ جہاں محویت کی جگہ بیداری شعور اور ''کھو جانے،، کے بجائے ''اپنے کو پا جانے،، کا احساس ملتا ہے! اقبال کا فن محویت و گم گشتگی کا فن نہیں، بلکہ بیداری و عمل کا آرٹ ہے: تجربہ اور مطالعہ و مشاہدہ نے اقبال پر اس حقیقت کو منکشف کر دیا تھا کہ شاعری کا جمالیاتی پیرایہ کس مقام پر پہنچ کر ''افیون،، بن جاتا ہے، اس لئے اقبال نے حافظ شیرازی کی شاعری پر خوب کس کر اور کھل کر تنقید کی۔ اقبال کے یہاں جو کوئی افیون کی گولی اور مارفیا کے انجکشن تلاش کرنے کی کوشش کریگا، اسے مایوسی ہوگی، اقبال کا فن سلاتا نہیں جگاتا ہے! اقبال کی شراب میں نشہ کی جگہ بیداری اور کسل واعضا شکنی کے بجائے چستی اور نشاط پایا جاتا ہے! اسکے یہاں پازیب کی جگہ تلوار کی جھنکار اور قلقل مینا کے بجائے نعرہ تکبیر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مگر یہ جھنکار اور گونج طبیعتوں میں تو حش و درشتی نہیں، انس و نرمی پیدا کرتی ہے—

زبان اقبال کی اردو شاعری ہمارا موضوع سخن ہے۔ فن کے اعتبار سے اقبال کے یہاں بڑی شستہ اور رواں زبان پائی جاتی ہے۔ اگر اقبال کی زبان کمزور ہوتی تو اس کا فن بھی کمزور ہوتا۔ زبان کی سلاست و شستگی نے اس کے فن میں جاذبیت اور دل کشی پیدا کی ہے۔ اقبال کا مولدو منشأ حطہ پنجاب ہے۔ اس کے لب و لہجہ تک میں اسی مرزبوم کی جھلک پائی جاتی تھی۔ مگر حیرت ہے کہ اقبال کی اردو شاعری کی زبان میں گنگ و جمن کا صاف و شفاف عکس نظر آتا ہے جیسے وہ قلعہ معلی کی زبان کی ہمجولی ہے!

اردو زبان میں غزلوں کے دفتر کے دفتر موجود ہیں، ان کو دیکھ کر غزل کہنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اسکے ثبوت میں انگریز شاعروں کی اردو غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر اقبال نے جن موضوعات پر فکر سخن کی ہے ان میں سے بعض موضوعات تو اردو زبان و ادب کے لئے بالکل اچھوتے ہیں۔ ان کی مثال و نظیر اردو شاعری میں سرے سے ناپید تھی۔ پھر فلسفیانہ مضامین کو اردو شاعری کے قالب میں ڈھالنا کتنا دشوار کام تھا، اور یہ کارنامہ وہی شاعر انجام دے سکتا تھا جس کو اردو زبان پر پوری قدرت حاصل ہو، اور جو لفظوں کے صحیح استعمال

سے با خبر ہو! اقبال نے اردو زبان و ادب کو جدید اصطلاحیں اور نئے استعارے اور تشبیہیں دیں، جن کے سبب اردو ادب کا دامن وسیع ہوگیا۔ کوئی شک نہیں اقبال کے کلام نے اردو شاعری کی آبرو بڑھائی ہے، اور اسے عزت و احترام کا بلند مقام عطا کیا ہے، اور نہ صرف مقام بلکہ ثروت و دولت بھی!

حنا بندی، لالہ کاری، تنک تابی، سحر خیزی، پیچاک، طلسم سامری، چراغ مصطفوی، شرار بو لہبی، رعشۂ سیماب، عروس لالہ، شرر زندہ، تقدیر امم، براق، کم اوراق، شیشہ بازی، خاراشگافی۔ قندیل رہبانی، بریشم، غلط آہنگ، فقر غیور، ضرب کلیم، بال جبریل،——اس قسم کی تراکیب و الفاظ کی جدت و تازگی نے اردو شاعری کو کس قدر وسیع اور صاحب ثروت بنا دیا ہے، یہ وہ نگینے ہیں جن کی جوت کبھی کم نہیں ہو سکتی!

اب رہیں زبان و محاورہ کی غلطیاں، تو دنیا کا وہ کون سا شاعر ہے جس کا کلام غلطیوں سے پاک و صاف ہے؟ میر و داغ زبان کے معاملہ میں درجہ استناد رکھتے ہیں، مگر ان تک کے یہاں روز مرہ اور محاورہ کے تسامحات ملتے ہیں۔ ہر انسان کے کام میں کسی نہ کسی حد تک کور کسر رہ ہی جاتی ہے، عیب و نقص سے پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے کام ہیں! اقبال سے بھی کہیں کہیں سہو اور تسامح ہوگیا ہے، مثلاً——

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بام گردوں سے و یا صحن زمیں سے آئی

''و یا،، وجدان کو بہت کچھ کھٹکتا ہے، یہ شعر اقبال کی نو مشقی کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے،

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی سوز دل پروانہ ہے

اس شعر میں پہلا مصرعہ کسقدر شگفتہ اور جاندار ہے۔ مگر مصرعہ ثانی اسکے جوڑ کا نہیں ہے!

جام شراب کوہ کے خم کدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کرکے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

''اڑاتی ہے،، اور ''پلاتی ہے،، کے تلفظ میں زبان کو جھٹکا سا لگتا ہے۔

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز　　اشارہ پاتے ہی زاہد نے توڑدی پرہیز

''پرہیز،، مونث نہیں مذکر ہے——اس شعر میں—

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر　　کہ جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے؟

''سے،، کی جگہ ''پر،، لانا چاہئے تھا، کسی قدیم شاعر کا مشہور مصرعہ ہے—

اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاکار نہ تھا

''بانگ درا،، میں ایک نظم ''التجائے مسافر بہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی،، ہے، اس کا ایک شعر ہے—

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی　　مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

خضر کی شخصیت کے متعین کرنے میں تو اختلاف ہے کہ وہ پیغمبر تھے یا فرشتہ تھے، مگر حضرت مسیح علیہ السلام پر کسی بڑے سے بڑے ولی اور صاحب ارشاد و تصوف کو ترجیح نہیں دی جا سکتی—

نبوت ہی صرف وہ کمال ہے جس میں تدریج و ترقی نہیں ہوتی، اور جو اللہ تعالیٰ کا محض عطیہ و موہبت ہے۔ اس میں بندہ کے کسب کو دخل نہیں ہے۔ باقی دوسرے کمالات و اوصاف میں تدریج و ترقی کی منزلوں سے لازمی طور پر گزرنا ہوتا ہے۔ اقبال کے افکار، اسلوب بیان اور ادب و انشاء کے پیرایہ میں تدریجاً ترقی ہوئی ہے، اور دوسرے شاعروں اور فن کاروں کی طرح مشق و مطالعہ نے اسکے کلام میں پختگی پیدا کی ہے۔ ''بانگ درا،، کا اقبال ''بال جبریل،، اور ''ضرب کلیم،، میں ہر اعتبار سے بلند تر نظر آتا ہے۔ ''بانگ درا،، میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں، جن میں شاعر کی فکر بلوغ کو نہیں پہونچی! بچپن اور بلوغ سے قبل کا زمانہ یعنی مراھقت انسان کے لئے کوئی عیب کی بات نہیں ہے، ہر انسان کی زندگی ان زمانوں سے گزرتی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی شاعری پر بھی بچپن، مراھقت اور بلوغ کے دور گزرے ہیں۔ یہاں تک کہ پھر ان کی شاعری، اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے، جہاں فضا میں شہپر جبریل کی آواز گونجتی ہوتی ہے——''شاعری جزویست از پیغمبری،، کی سی کیفیت: یہ اقبال کی شاعری کا شباب ہے، اور اس شباب نے بڑھاپے کی ایک شام بھی نہیں دیکھی—

اقبال کے جن اشعار پر ابھی ابھی احتساب کیا گیا ہے، وہ کلام اقبال کے محاسن کے سامنے ایسے ہیں، جیسے کوہ الوند کے مقابلہ میں چند ذرے! مگر اس سے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ تو ضرور ہو جائے گا کہ مقالہ نگار اپنے ممدوح شاعر کا اندھا عقیدت مند نہیں ہے۔ اس بدر کمال میں جہاں کہیں کوئی جھائیں بھی پائی جاتی ہے، ناقد کی نگاہ سے وہ چھپی نہیں رہتی۔ اور اقبال کے کلام کا اس نے مطالعہ صرف عقیدت مند اور منقبت خواں بن کر ہی نہیں کیا، نگاہ تنقید بھی اپنا فرض انجام دیتی رہی ہے—

منظرنگاری

ہر شاعر کا ایک پسندیدہ موضوع اور طبیعت و مزاج کا کسی مخصوص صنف شعر و ادب کی جانب میلان ہوتا ہے۔ ''منظرنگاری،، اقبال کی شاعری کا موضوع نہیں رہا۔ اقبال صاحب پیام شاعر ہے اور پیغام بر منظر نگاری نہیں کیا کرتے۔ مگر یہ صنف بھی اقبال کے کلام میں جہاں جہاں پائی جاتی ہے، وہاں اس کا آرٹ اپنی شدت انفرادیت کے ساتھ ابھرتا ہوا نظر آتا ہے———نظم ''ہمالہ،، کا ایک بند:—

لیلی شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

شام کے وقت درختوں کا جو عالم ہوتا ہے، اس کو ''تفکر کا سماں چھایا ہوا،، کہہ کر اقبال نے منظر کشی کے شاعرانہ فن کا کمال دکھایا ہے!

''ابر کوہسار،، کے چند منتخب اشعار—

سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں　　زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

مصرع ثانی کسقدر سائنٹفیک ہے، جسے خشک و بے کیف ہونا چاہئے، مگر اقبال کے اسلوب بیان نے اس میں کتنی شعریت پیدا کردی—

چشمہ' کوہ کو دی شورش قلزم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا ''قم،، میں نے

''ابر کوہسار،، سے پہاڑی چشموں کو کیا ملتا ہے، اور سبزہ کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہوتا ہے، اس شعر میں اس کا اظہار جس خوبی کیساتھ کیا ہے، اس پر وجدان بے اختیار ''مرحبا،، پکار اٹھتا ہے—

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے بھرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو، جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
(ایک آرزو)

یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر ہر دل کا نمائندہ اور ہر زبان کا ترجمان بن جاتا ہے، اور اس کی اپنی آرزو، سارے جہان کی آرزوؤں کا مظہر ہوتی ہے! موضوع نظم کے اعتبار سے اقبال نے کسقدر نرم و نازک لفظوں کا انتخاب کیا ہے، ندی کے صاف پانی کو مصور بنا کر حسن تعلیل کی کتنی دل نشین صنعت پیدا کردی!

''پیام صبح،، میں نسیم سحری کو متکلم بنایا ہے :—

نکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہو کر
چٹک او غنچہ' گل، تو موذن ہے گلستاں کا

شعر و سخن کی یہ وہ نازکی اور لطافت ہے، جہاں ''مصوری،، بے رنگ اور عاجز و درماندہ نظر آتی ہے—

ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

شرح و بیان سے اس شعر کی لطافت غائب ہو جائیگی، خاص طور سے مصرعہ ثانی حباب سے بھی نازک تر ہے، اور حباب کو چھو کر بد مذاقی اور بے رحمی کا الزام کون اپنے سر لے—

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لیکر لالہ کے پھول مارے
(بزم انجم)

لالہ کے پھول کسی چیز پر مارے جائیں تو ان کے لگنے سے سرخ اور عنابی نشان جگہ جگہ پڑ جائیں گے۔ شاعر نے شام کے وقت ''شفق،، کی رنگت کے لئے جس تشبیہہ و تعلیل سے کام لیا ہے، وہ منظر کشی کا اعجاز ہے۔

جگنو، پروانہ، تتلی، بھونرا، کویل، چکور، بلبل——پر شعراء نے بڑے معرکہ کی نظمیں کہی ہیں۔ ان موضوعات پر جتنی نظمیں مختلف زبانوں میں میری نگاہ سے گزری ہیں، ان تمام نظموں میں اقبال کی نظم——جگنو——فکر و خیال، مصوری، منظر کشی، اظہار و بیان، تشبیہ و استعارہ، روانی و لطافت، دل کشی اور اثر انگیزی میں ہر اعتبار سے بلند ہے!

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

جگنو——پھولوں کی انجمن کی شمع ہے، آسمان سے اڑ کر آنے والا ستارہ ہے، مہتاب کی وہ کرن ہے جس میں قدرت نے جان ڈال دی ہو، شب کی سلطنت میں دن کا سفیر ہے، مہتاب کی قبا سے گرا ہوا تکمہ ہے، اور ایک ذرہ ہے جو سورج کے پیرہن میں نمایاں ہوکر جھلمل جھلمل کر رہا ہے——یہ تشبیہات کسقدر نادر اور اچھوتی ہیں، کیا لطف بیان ہے، کسقدر نازک صنعت گری ہے!

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغان بے نوا کو
گل کو زبان دے کر، تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلھن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا، شبنم کو آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ھوا کو
پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی
یہ امتیاز لیکن اک بات ھے ھماری
جگنو کا دن وھی ھے جو رات ھے ھماری

''بانکی دلھن،، اور ''اک بات ھے ھماری،، ان دو ٹکڑوں کے علاوہ ھر مصرعہ اپنی جگہ شاعرانہ فن کاری کی معراج ھے، ان شعروں کو جتنی بار پڑھیے، اک نیا لطف محسوس ھوتا ھے!

اقبال کی ایک نظم میں جگنو پرندے سے کہتا ھے :—

لباس نور میں مستور ھوں میں　　پتنگوں کے جہاں کا طور ھوں میں

شاعری کا یہی وہ مقام ھے جس کے لئے عربی کے مشہور شاعر فرزدق نے کہا تھا کہ شاعری کے بھی بعض ایسے مقامات ھیں جن کو پڑھ کر اور سن کر ارباب ذوق پر سجدہ واجب ھو جاتا ھے—

محبت کیا ھے؟ کن عناصر سے مرکب ھے؟ اسکے اجزائے ترکیبی کیا ھیں؟ اس کی تفصیل اقبال کی زبان سے سنئے اور وجد کیجئے—

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برھم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ھائے، مسیح ابن مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
منک سے عاجزی، افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

ان شعروں کی شرح و تفصیل کرنے سے ان کی شعریت مجروح ہو جائے گی ۔ گلاب کی نرم و نازک پتیاں تشریح کے عمل کو کہاں برداشت کر سکتی ہیں !

اقبال کا فن اور پیام ''منظر نگاری،، جسکی مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں، یہ بھی اقبال کے فن ہی کے شاہکار نمونے اور اس معدن کے گراں بہا لعل و گہر ہیں ! حقیقت یہ ہے کہ جو اقبال کا پیام ہے، وہی اس کا فن (Art) ہے اور جو اس کا فن ہے، وہی اس کا پیام ہے، اقبال نے اپنا اور لوگوں کا دل بہلانے اور فرصت کے اوقات گزارنے کے لئے شاعری نہیں کی۔ اس کی شاعری ذہن و فکر کی تربیت اور سیرت و کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ وہ اپنے قدر دانوں سے واہ واہ اور مرحبا کا طلب گار نہیں ہے۔ وہ اپنے فن کی داد زبان عمل سے چاہتا ہے ـــــ نالہ نیم شبی، آہ سحر گاہی، سوز دل، فقر حیدری، جرات خالد، صدق خلیل، عزم حسین، ایمان صدیق، سطوت فاروق، یہ ہے اقبال کے فن کا صلہ، اس کی شاعری کی داد و تحسین اور اس کے آرٹ کی قدر شناسی ! اقبال کو مشاعروں کی تالیوں کی گونج اور واہ واہ کا شور نہیں چاہئے۔ ایسی باتیں اسکی عظمت فن کیساتھ مذاق ہیں ! اقبال کے فن کی کم سے کم تحسین مژہ کی نمناکی اور دل کی بے تابی ہے !

اقبال کو اس کا یقین تھا اور خود اعتمادی تھی کہ اس نے اپنے پیام کو اس قدر کامیاب موثر فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ ماحول میں اس سے حرکت اور فضا میں بے چینی پیدا ہونی ہی چاہئے—

پس من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند
کہ عالم را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

''خیال و اظہار،، شعر و سخن کا تانا بانا ہیں، انہی سے شعر ترکیب پاتا ہے! اول تو ہر خیال اظہار کے قابل نہیں ہوتا۔ حقیقی شاعر یہ نہیں کرتا اور نہ اسے کرنا چاہیئے کہ جو خیال ذہن میں آیا اسے جھٹ سے نظم کر دیا۔ شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں بھی ہر طرح کے برے بھلے خیالات آتے رہتے ہیں، ـــــ شاعر کو اس کا شعور اور تمیز ہونی چاہئے کہ کونسا خیال قابل اظہار ہے۔ اور کونسا نہیں ہے ـــــ دوسری چیز یہ کہ جو خیال قابل اظہار ہے اسے کس پیرائے میں ظاہر کیا جائے۔ اگر خیال و اظہار اور فکر و بیان میں ربط و ہم آہنگی نہ ہو، تو بلند سے بلند لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک خیال کی لطافت و نازکی غارت ہو جاتی ہے، اور اس کا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔ بیان و اظہار ہی سے شعر میں قوت، جان، دل کشی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے—

کوئی شک نہیں رمزیت و اشاریت شاعری کا حسن ہے، جو لطف اجمال میں ہے وہ تفصیل میں کہاں؟ لیکن زبان اور اظہار و بیان کے اسلوب پر پوری طرح قدرت نہ ہونے سے رمز و کنایہ اور اشارہ ''مبہم،، بن جاتا ہے! شعر و ادب کا لطف الجھاؤ میں نہیں سلجھاؤ میں ہے۔ شعر کو لغز و معمہ بنا دینا شاعری کا کمال نہیں بہت بڑا نقص ہے۔ الجھی ہوئی فکر کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان بھی خط شکستہ کی طرح جگہ جگہ اکھڑا ہوا اور ژولیدہ ہو تو اس قسم کا شعر وجدان کو شدید ضیق میں مبتلا کر دیتا ہے! ایسا شعر سنکر اور پڑھ کر طبیعت میں بڑی گھٹن ہوتی ہے۔ شعر کا دقیق و نازک ہونا یقیناً خوبی کی بات ہے۔ مگر شعر کا گنجلک ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں، بلکہ شعر کا عیب ہے—

اقبال کے یہاں خیال و اظہار میں ربط و آہنگی کی معراج نظر آتی ہے، جیسے اس عروس فکر و تخئیل کے لئے الفاظ کا ٹھیک یہی پیرہن موزوں تھا، اقبال کے افکار کسقدر نازک اور عمیق ہیں۔ لیکن اسلوب بیان نے اس نازکی و عمق کو اس قدر سلیس و رواں اور دلکش بنا دیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے وجدان کو فرحت و آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اظہار و بیان میں نزاکت ہے، مگر الجھاؤ نہیں، فکر میں گہرائی ہے، لیکن یہ گہرائی ''المعنی فی بطن الشاعر،، نہیں بننے پائی!

اقبال کی شاعری میں موضوع کے اعتبار سے آہنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس کا فن کہیں شعلہ ہے، کہیں شبنم ہے، کہیں شاخ گل ہے، کہیں تلوار ہے۔

وہ آتش نوا مغنی بھی ہے، اور دلوں کو دھڑکا دینے والا رجز خواں بھی! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال کے فن میں عظمت و شکوہ کے ساتھ تقدیس و عصمت پائی جاتی ہے، جس سے نوجوانوں کی خلوتوں اور تنہائیوں کو پاکیزگی ملتی ہے۔ یہ بات میں نے خاص طور پر اس لئے کہی ہے کہ شاعری کا عام مزاج یہ ہے کہ اس سے نوجوانوں کی راتوں اور خلوتوں کو چٹخارے ملتے ہیں!

دوسری زبان کے شعر کا اپنی زبان میں ترجمہ، اس انداز کے ساتھ کہ اصل شعر کی تمام خوبیاں باقی رہیں، بڑا دشوار کام ہے۔ اردو زبان میں شاعروں نے رباعیات خیام، شکنتلا، دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم یہاں تک کہ قرآن کریم تک کو منتقل کر دیا ہے، مگر ان منظوم تراجم میں عام طور پر—

دندان تو جملہ در دھانند

کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے قرآن کی ایک آیت (یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولوکرہ الکافرون) کو اردو میں البتہ اسقدر حسن و خوبی کے ساتھ منتقل فرمایا ہے کہ یہ شعر—

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

ترجمہ کا مثالی شاہکار بلکہ نقش دوام بن کر رہ گیا ہے!

اقبال نے ''بال جبریل،، کا سرنامہ سنسکرت کے مہاکوی بھرتری ہری کے شعر کو بنا کر بے تعصبی، وسعت ظرف، علم دوستی اور فنی اخوت کی ایک مثال قایم کردی—

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

یہ ترجمہ نہیں، ترجمہ کا معجزہ ہے؟ اردو دنیا کے لئے بھرتری ہری ایک گمنام شاعر تھا، مگر اقبال کے اس شعر نے بھرتری ہری کو اردو دنیا میں شہرت دوام عطا کردی—

اقبال کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا ہے، اسی لئے اقبال نے اپنے دور کے سب سے بڑے غزل گو جہاں استاد داغ دھلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ مشورت و تلمذ کا یہ زمانہ بہت مختصر رہا۔ اقبال کی نومشقی کی غزلوں کے تیور بتا رہے تھے کہ اس شاعر کو مستقبل میں روایتی غزل گو شاعر نہیں بلکہ کچھ ''اور،، بننا ہے! مگر کیا بنتا ہے؟ اس کا اندازہ اقبال کے استاد داغ کو بھی نہ تھا!

اقبال پر آغاز جوانی میں شعر گوئی کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے—

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بت اقبال
حضرت داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں

— اور —

میں نے کہا کہ بے دھنی اور گالیاں!
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
تصویر میر نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے
بگڑے حیا نہ شوخئی رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے

—مگر—

شعر گوئی کے اس عہد طفولیت میں بھی اقبال کے ایسے شعر—

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دھر تمام
سیر اس باغ میں کر باد سحر کی صورت

حال دل کس سے کہوں اے لذت افشائے راز
ایک بھی اس دیس میں محرم نہیں ملتا مجھے

اقبال کے شاعرانہ مستقبل کا اتا پتا دے رہے تھے—

رسالہ ''خدنگ نظر،، (۱۹۰۳ء) میں اقبال کی ایک غزل شائع ہوئی تھی— جس کا مقطع ہے—

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

شاعری کے اس بچپن میں اقبال نادر کاکوروی اور میر غلام بھیک نیرنگ کو اپنا ہم صفیر سمجھتا ہے۔ مگر اقبال کی شاعری جب جوان ہو جاتی ہے تو روح القدس اقبال کو اپنا ہم صفیر نظر آتا ہے، اور بچپن کی شاعری کے ساتھی اور نواسنج منزلوں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا پہلا نقش قدم نہ جانے کتنے شاعروں کی آخری منزل ہے!

ایک شہسوار کو بچپن میں گھٹنوں چلنا پڑتا ہے، اور ایک فصیح اللسان اور آتش بیان مقرر بھی عہد طفولیت میں تتلا تتلا کر باتیں کرتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری کا بچپن بھی بولنے اور چلنے میں، اس طرح کے تتلانے اور گرنے پڑنے سے خالی کس طرح رہ سکتا تھا:—

شجر ہوں گری مجھ پہ برق محبت — ہرا ہوگیا ہوں پھلا چاہتا ہوں
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

یہ شعر اسی دور طفولیت کی یادگار ہیں—

بڑے ہوکر اقبال کے اندر ایک فکری ولولہ پیدا ہوا۔ پری وشوں کو تاکنے جھانکنے، حسینوں سے میل جول بڑھانے، اور معشوقوں کی گلیوں کی خاک چھاننے کا نہیں——یہ ولولہ تعمیر و اصلاح اور انقلاب و حرکت کا ولولہ تھا۔ ایک طرف اسلام کے غالب ہونے کی فطرت کا اقبال نے مطالعہ کیا۔ دوسری طرف ملت اسلامیہ کی زبوں حالی اور مظلومیت و ابتری کو دیکھا۔ اس ولولہ اور اس احساس و درد نے اقبال کے کاروان فکر و نظر کا رخ ہی موڑ دیا۔ غزل اس ولولہ اور احساس کی کہاں متحمل ہوسکتی تھی:

اقبال اگر صرف غزل گوئی پر قناعت کرتا تو اسکی شاعری میر کی شاعری کی طرح ''آہ،، اور غالب کی شاعری کی مانند ''واہ،، بن سکتی تھی مگر وہ اردو ادب کے لئے دلیل راہ نہ بنتی—

غزل گوئی کی مشق نے اقبال کے فن کو یہ فائدہ پہنچایا کہ اقبال کو لفظوں کے ٹھیک طور پر برتنے کا ملکہ اور سلیقہ آگیا۔ لفظوں میں نرمی

بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی، وہ آتش مزاج بھی ہوتے ہیں اور شبنم طبع بھی۔ اس نرمی و گرمی اور آتش مزاجی و شبنم طبعی کو کس طرح کام میں لایا جائے؟ شعر میں لفظوں کے در و بست سے نغمگی کسطرح پیدا ہوتی ہے؟ کس کوتاہی کے سبب شعر کی قبا میں جھول اور سلوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں؟ تنافر، ضعف تالیف، شتر گربگی اس قسم کے عیوب سے بچنے کے لئے کس احتیاط کی ضرورت ہے؟ اس مشق نے، مطالعہ نے، تجربہ نے، اقبال کے فن کو ترقی و پختگی اور اس کے جوہر طبع کو براقی عطا کی!

اقبال بلوغ فکر ہی کیساتھ روایتی غزل گوئی سے دامن کشاں نظر آتا ہے۔ مگر تغزل جو اسکی شاعرانہ فطرت بن چکا تھا، اس کا رچاؤ اس کے فن کے آخری شاہکار تک میں پایا جاتا ہے؟ پھر بھی غزل گوئی کے اس دور کا یہ شعر—

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

سیکڑوں غزلوں پر بھاری ہے!

اردو غزلگوئی کا پہلا موڑ، غالب کا یہ شعر ہے—

نقش فریادی ہے کس کی شوخئی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

——اور دسرا موڑ——

اقبال کے یہ اشعار ہیں :—

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

ان شعروں کو سنکر عوام ہی نہیں خواص تک چونک پڑے کہ ولی دکنی سے

لیکر امیر و داغ تک یہ آہنگ تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ یہ تو ''لے،، ہی دوسری ہے اور یہ لب و لہجہ ہی سب سے مختلف ہے! اور پھر یہ آہنگ اور لب و لہجہ ان شعروں :—

اگر کجروھیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

میں ڈھل کر دنیائے تغزل میں ایک ایسا نادر عجیب اور خوشگوار انقلاب پیدا کرتا ہے، جسکی نظیر اردو کیا فارسی شاعری میں بھی نہیں ملتی!

''غزل'' عربی میں کہتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنے اور ان کے حسن و جمال کی تعریف کرنے کو، ''غازل،، کے معنی ہیں عورت سے بات کرنا اور پھسلانا—''الغزل،، عورتوں کے ساتھ کھیل کود—اقبال کی غزل میں نہ تو عورتوں سے ہمکلامی ہے، نہ ان کو اپنی طرف مائل کرنے کا داعیہ ہے، نہ ان کے ساتھ لہو و لعب اور کھیل کود ہے۔ اقبال کا تغزل فطرت سے ہمکلامی اور انسانیت سے خطاب ہے، اقبال کا تغزل عشق بازی اور ہوسناکی نہیں سکھاتا، اس میں نہ تو عورتوں سے چھیڑ چھاڑ ہے اور نہ رقیبوں سے جنگ و جدال ہے، اقبال کا تغزل عورتوں سے آنکھیں لڑانا نہیں ، بلکہ آنکھوں کو غیرت و حیا کے بار سے جھکانا سکھاتا ہے، کہ بدکاری کے فتنہ کا آغاز نظارہ و نگاہ ہی سے ہوتا ہے۔ عشق بازی کے چٹخاروں کا سہارا لئے بغیر غزل ایک قدم نہیں چل سکتی، اس حمام میں بڑے بڑے پاکباز اور سنجیدہ شاعروں تک کو نیم برھنہ ہونا پڑا ہے۔ مگر اقبال کا تغزل عصمت و تقدیس کے سایہ میں شوخیاں دکھاتا ہے۔ اور شریفانہ جذبات کو چونکاتا ہے! عام غزل گوؤں کی صف میں اقبال کو کھڑا نہیں کیا جا سکتا، کہ اس کا تغزل سب سے جدا گانہ شان اور منفرد آہنگ رکھتا ہے—

اقبال کے محاسن فن کو چند صفحوں میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ اس کے ایک ایک گوشہ پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے! اقبال کے فن کا ذکر چھڑتے ہی ''داماں نگہ تنگ، گل حسن تو بسیار،، سے سابقہ پڑتا ہے! میں اقبال کے اشعار کی فنی اور معنوی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جاؤں گا—

یا رب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خط پیمانہ' دل

سب سے بڑی خوبی تو اس شعر میں یہ ہے کہ ''ساغر،، ''مے،، اور ''خط پیمانہ،، جیسے استعاروں کے باوجود، ذہن اس شراب کی طرف منتقل نہیں ہوتا جو بھٹیوں پر کھینچتی اور شراب کی دکانوں پر بکتی ہے۔ پھر ''خط پیمانہ' دل،، کو ''جادۂ ملک بقا،، کہکر شاعر نے دل کی اہمیت ، افادیت، وسعت اور فعالیت کو جس شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے، اس پر جتنا غور کیجئے. دل و دماغ کو اتنی ہی بالیدگی اور نشاط حاصل ہوتا ہے —

آڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے ملکر لوٹ لی طرز فغاں میری

اس مضمون پر غالب کا یہ شعر یقیناً نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے—

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

مگر اقبال نے جس پیرائے میں اس مفہوم کو ادا کیا ہے، اس نے مضمون میں نیا پن پیدا کر دیا ہے ۔ مصرعہ اولی کس قدر مترنم اور شگفتہ ہے!

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت ہے

میں نے اقبال کے اس شعر کو خاص طور سے اس لئے منتخب کیا ہے کہ بعض اردو شعراء گیت اور دوہے بھی کہنے لگے ہیں، مگر ہندی کے ہلکے پھلکے شعروں کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ لاکر اپنے کہے ہوئے بولوں کو ''آدھا تیتر اور آدھا بٹیر،، بنا دیتے ہیں؟ اقبال نے کس سلیقہ کے ساتھ ہندی شبدوں کے موتیوں کی سچ مچ مالا پرو دی ہے!

واعظ، صوفی، ملا اور زاہد پر طنز و تنقید شاعری کا موضوع رہا ہے، حافظ کا مشہور شعر ہے :—

به زیر دلق مرصع کمندها دارند
دراز دستی این کوته آستیناں بین

غالب نے اس مضمون کو اور ترقی دے دی :—

ز نہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودی و نبی را بہ درودی

لیکن اقبال کا یہ شعر :—

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز اٹھتا ہے آواز اذاں سے

نفسیاتی نزاکت کے اعتبار سے اپنی جگہ اس قدر منفرد ہے کہ شاید ہی کوئی شعر اس کا حریف ہو سکے۔ ''دلق مرصع،، میں چھپی ہوئی کمندوں اور درود و سجود کا فریب نظر آ سکتا ہے، مگر آواز اذاں سنکر لرز اٹھنا، ایک ایسی باریک چال ہے کہ ''تلبیس ابلیس،، کے مصنف اور عابدوں، زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کے دلوں کی چوری پکڑنے والے علامہ ابن جرزی بھی اس سے دھوکا کھا سکتے ہیں—

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

''روکنے،، کی جگہ ''تھام،، لاکر شاعر نے، شعر میں کتنی قوت اور جان پیدا کردی۔ خام کاروں کو پختہ کار بننے کی تلقین جس انداز میں کی گئی ہے، یہی اقبال کے ''فن،، کا کمال ہے—

ابر نیساں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک
مرے[1] کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

شعر میں لفظوں کا در و بست اتنا حسین ہے کہ پڑھنے میں زبان حلاوت محسوس کرتی ہے!

۱—کتاب میں ''مرے،، لکھا ہے لیکن شعر میں ترنم ''میرے،، سے پیدا ہوتا ہے (م—ق)

پھر باد بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر، گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

یہی وہ مقدس تغزل ہے جس کے سامنے غزل کی اباحت شرما سی جاتی ہے۔

مری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معنیٰ کی
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

اردو کے کسی قدیم شاعر کا بہت مشہور شعر ہے۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں، گل بوٹا کہاں ہے

مگر اقبال کے شعر کے آگے یہ شعر ایسا ہی ہے جیسے کسی تنومند حسین و وجیہ سرو قد کے آگے کوئی بالشتیا (قزم—— Dwarf)

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمہ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

''بے نیازی،، کی حقیقی شان اسی وقت ظاہر ہوتی ہے، جب دسترس کے باوجود کسی چیز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

عشق کی تیغ جگر دار اڑائی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

اگر یوں کہا جاتا کہ علم جامد بن کر رہ گیا ہے، تو یہ ایک واعظانہ بات ہوتی۔ اقبال نے علم کو نیام اور عشق کو تیغ جگر دار کہکر، دونوں کے فرق اور وظیفہ عمل (Function) کو واضح کر دیا کہ عشق اور ولولہ کے بغیر تنہا علم ایک خالی نیام ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑدے

دنیا کی ہر زبان کے اچھے شعروں کا انتخاب کیا جائے تو اقبال کا یہ شعر یقیناً اس انتخاب میں جگہ پائے گا۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
اگر نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور یہ مٹی اشک صبح گاہی یا خون دل ہی سے نمناک ہو سکتی ہے!

تو ہے محیط بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بیکنار کر

کتنی اچھوتی اور پاکیزہ تمنا ہے! مصرعہ ثانی میں ''ہمکنار،، اور ''بے کنار،، کی صوتی تکرار نے کس قدر نغمگی پیدا کردی——

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

شعر کیا ہے ''آیت،، ہے!—تخیل نادر و بدیع اور اظہار اس سے زیادہ حسین و جمیل!

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

کہنا یہ تھا کہ خاک عجم سے پھر کوئی رومی جیسا انسان پیدا نہ ہو سکا۔ مگر اقبال نے اس خیال کو جن لفظوں میں ادا کیا ہے، ان کے حسن لطافت پر وجدان درود پڑھنے لگتا ہے—

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

حق کو ''چراغ مصطفوی،، اور باطل کو ''شرار بو لہبی،، سے تشبیہ دیکر شعر میں کسقدر واقعیت، لطف اور شکوہ پیدا کر دیا! پھر حق کو ''چراغ،، کہا اور باطل کو ''شرار،، اس فرق کی نزاکت شعر کے دوسرے محاسن پر مستزاد!

پھر ''بو لہب،، کی معنویت کے ساتھ لفظ ''شرار،، کی مناسبت، یہ تجنیس معنوی نورٌ علی نور!

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

امت مسلمہ کی وحدت و اتحاد و یک جہتی پر یہ شعر الہام کے حدود کو چھو رہا ہے—

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے گوہر کی ہے سیرابی

ظالم کا ظلم اور باطل کی شورش ہی مظلوموں اور حق پسندوں کو بیدار کرتی اور انہیں حوصلہ مند بناتی ہے——مصرعہ ثانی میں تشبیہ کتنی مکمل اور تام ہے—

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

مصرعہ ثانی اردو زبان و ادب میں ضرب المثل بن چکا ہے!

حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے

حنا بندی——عروس لالہ——خون جگر——معمار و براہیم، اقبال کی پسندیدہ اصطلاحیں۔ ہیں ان اصطلاحوں سے اقبال شاعری کے شالامار اور ادب کے تاج محل تعمیر کرتا ہے—

میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

پہلے شعر میں مرد مومن کو حرکت عمل کا پیام دیا گیا ہے، اور دوسرے شعر میں بتایا ہے کہ کائنات میں اس کا مقام اور کام کیا ہے ''میان شاخساراں،،—— ''شاہین قہستانی،،—— ''گہاں آباد ہستی،،—— ''قندیل رہبانی،، ان ترکیبوں کے حسن اورشکوہ کو دیکھئے—

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

اس شعر میں مظلوم و پامال مسلمانوں کے شکستہ دلوں کو تھامنے اور جوڑنے کی کتنی قوت پائی جاتی ہے!

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری،، تہذیب حاضر کی ظاہری چمک دمک پر کسقدر بھرپور تنقید ہے—

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ایسے ہی شعروں پر ''جزویست از پیغمبری،، کی مثل صادق آتی ہے!

شکوہ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبول حق ہیں فقط مرد حر کی تکبیریں

مظلوم و مقہور مسلمانوں کو کس موثر انداز میں غیرت دلائی ہے؟ شعر کے تیور کتنے تیکھے ہیں—

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں　　　تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

جبر و قدر اور تقدیر و تدبیر کے مسائل کتنے الجھے ہوئے اور متنازعہ فیہ ہیں! اقبال نے مسلمان کو ''تقدیر یزداں،، کا درس دیکر اور اس منصب کا سزاوار بناکر ''تقدیر،، کی دینی حیثیت کو بھی نہیں چھیڑا اور ''عمل و حرکت،، کی ضرورت اور اہمیت کا بھی اظہار کر دیا——! نہ جانے کتنے معرکے سر کرنے

اور کتنے طوفانوں سے گزرنے کے بعد ھی کوئی شخص ''تقدیر یزداں،، بن سکتا ھے—

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ھے اگر کانٹے میں ھو خوئے حریری

خودی کو ناموس اور عزت و عفت کی حفاظت کے لئے سخت بلکہ درشت بننے کی ضرورت ھے—اس خیال کو اقبال نے کس دل نشیں انداز میں ادا کیا ھے ''خوئے حریری،، کی لفظی ترکیب اس شعرمیں نگینہ کی طرح دمک رھی ھے—

باقی نہ رھی وہ تری آئینہ ضمیری اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

''آئینہ ضمیری،، ھی نے شعر کو بہت کچھ چمکا دیا تھا، مصرعہ ثانی میں صنعت ایجاز نے اس کے حسن کو اور دوبالا کردیا—

ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ھے :—

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاھی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاھی میں اسے

''مزاج خانقاھی،، پر اس طرح کی طنز کرکے کہ ابلیس اپنے اخوان اور مشیروں کو تاکید کرتا ھے کہ مسلمان میں جو مزاج خانقاھی پیدا ھو گیا ھے، اسے پختہ تر کر دیا جائے، اقبال نے اس طلسم کشف و مراقبہ پر شاہ ضرب لگادی۔

صاحب ساز کو لازم ھے کہ غافل نہ رھے
گاھے گاھے غلط آھنگ بھی ھوتا ھے سروش

اس شعر میں ''غلط آھنگ،، کا حسن آھنگ دیکھئے! اس نغمہ طرازی کے پردے میں یہ پیغام دیا گیا ھے کہ دل کی حالت سے آدمی کو ایک لحظہ کے لئے بھی غافل و بے خبر نہیں رھنا چاھئے!

میں جانتا ھوں جماعت کا حشر کیا ھوگا
مسائل نظری میں الجھ گیا ھے خطیب

یہ شعر عمل و حرکت کا پیغام ہے، اس میں طنز ہے فلسفہ و کلام، الہیات و تصوف کے مسائل اور فقہ کی اس مغروضہ جزئیات پر جس کا عمل سے برائے نام تعلق ہوتا ہے! اس شعر کی معنویت ''مسایل نظری،، میں اس طرح جھلک رہی ہے جیسے موتی میں آب!

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبال نے عقل کی ضرورت و افادیت کی کہیں نفی نہیں کی۔ ہاں! اس کو حکم اور رہبر کامل نہیں مانا۔ عقل منزل مقصود کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے، وہ اندھیرے میں چراغ دکھا سکتی ہے، مگر وہ ذریعہ ہے اصل مقصود نہیں ہے۔ جس نے صرف عقل ہی پر بھروسہ کیا، وہ منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکا!

میرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو

حمد و دعا کا یہ وہ مقام ہے، جہاں بندہ اپنے رب کو واقعی شہ رگ سے بھی نزدیک تر محسوس کرتا ہے۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ واقعہ ہے کہ سائنس جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے، آدمی اتنا ہی بے مروت خود غرض، آرام پسند اور آخرت فراموش ہوتا چلا جارہا ہے۔

جس کھیت سے دھقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ' گندم کو جلا دو

اشتراکیت مر کر اگر کبھی زندہ ہوئی تو اس شعر کے سہارے زندہ ہوگی۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

شیخ کی ریا کاری اور دنیا طلبی پر ایسا کاری وار شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کیا ہو! مصرعہ ثانی فن کے اعتبار سے کسقدر جاندار ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

غلامی اور محکومیت میں سچ مچ یہی ہوتا ہے کہ غلام اپنے آقا کی نگاہ سے ہر چیز کو دیکھتا اور اس کے دماغ سے سوچتا ہے! اس کی زندہ مثال خود ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ہیں کہ رقص و سرود، بت گری، مصوری، عورتوں کی بے حجابی، یہ تمام چیزیں انگریز کی نگاہ میں خوب و زیبا تھیں، اس لئے ہم بھی ان کی خوبی و زیبائی پر آج تک فریفتہ ہیں—

مے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن
کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی

کار لائل نے اس قسم کے شعروں سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ—''شعر مترنم خیال ہے،،—

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

عربی کی مشہور ضرب المثل ''الحق مر،، کی شاعرانہ توضیح!

اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

اقبال کا یہ وہ انداز بیان ہے، جو صرف اسی کے لئے مخصوص اور مقدر کر دیا گیا ہے!

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پاکستان اسی شعر کی باز گشت ہے!

آذر کا پیشہ خارا تراشی
کار خلیلاں خارا گدازی

اس دور میں جسے ''آرٹ،، کہا جاتا ہے، اس بت کے لئے یہ شعر تیشہ براہیمی ہے!

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

اس شعر میں اقبال نے ان فلسفیوں اور سائنس دانوں کے نظریہ کی تردید کی ہے جو ''مادہ،، ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں اس عالم آب و گل کے علاوہ اور اس کے بعد نہ کوئی دوسرا عالم ہے اور نہ زندگی ہے!

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

قطرہ شبنم کے مقابلہ میں نسیم سراپا حرکت و عمل ہے، اس لئے نسیم کی بے تابی اگر شبنم کا ساتھ نہ دے تو غنچہ نشو و نما ہی نہیں پا سکتا! کالرج نے غلط کہا تھا ''شعر کا راست مقصد انبساط ہے نہ کہ صداقت،، اقبال کا یہ شعر اسکے اس نظریہ کو چیلنج کرتا ہے——اقبال کے اس شعر میں نشاط و انبساط کے علاوہ صداقت و واقعیت بھی پائی جاتی ہے—

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال رہبانیت اور بھکشوؤں اور برہمچاریوں کی زندگی کا بہت بڑا مخالف ہے۔ اس شعر سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہوجائے کہ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کا درس دے رہا ہے! اقبال نے اس شعر میں فاتحوں، کشورکشاؤں، حوصلہ مندوں بلکہ یوں کہئے صدیق و فاروق اور سلمان و حیدر اور خالد و ضرار کے کرداروں کی طرف شاہین کے استعارے میں اشارہ کیا ہے، کہ وہ دنیا پر چھا گئے اور قیصر و کسری کے تخت و تاج روند ڈالے، مگر دنیا کی چمک دمک میں نہ الجھے——شاہین کو ''پرندوں کی دنیا کا درویش،، کہکر اقبال نے اپنے فن کی نمائش نہیں کی۔ اس کا فن خود بخود اس طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے پھول سے خوشبو اور چاند سے روشنی—

باغی مرید اپنے پیروں پر اقبال کی زبان سے یوں احتساب کرتے ہیں——

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

شعر کیا ہے، نغمۂ زبور ہے!! سبحان اللہ!

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

شعر کا یہ آہنگ روح القدس کی تائید کے بغیر کہاں میسر آتا ہے؟
روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے :-

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیر خودی کر، اثر آہ رسا دیکھ

انسانی شخصیت کے کتنے پہلو ایک بند میں پیش کردئے——پھر کسی مصرعہ میں ذرا سا جھول بھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ ہر مصرعہ ترشے ہوئے پہلو دار ہیرے کے مانند تابناک اور متناسب نظر آتا ہے—

ابلیس——جبریل سے کہتا ہے :—

گر کبھی فرصت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کہ رنگیں کر گیا کس کا لہو

جن صوفیانے ابلیس کو ''موحد،، کہا انھوں نے ٹھوکر کھائی! ابلیس کی شخصیت اور قرآنی تلمیح کو اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کرکے کس قدر لطف پیدا کردیا—

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

صوفی و ملا کی عافیت کوشی اور آرام طلبی پر کتنی فن کارانہ پھبتی چست کی ہے، سر دامن کے چاک نہ ہونے نے، اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ صوفی و ملا کو جنون محبت کی ہوا بھی نہیں لگی۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جسکو پہاڑوں نے رعشۂ سیماب

مصرعہ ثانی کے تیور دیکھئے، یہ اسلوب بیاں اردو کے کس شاعر کو نصیب ہوا ہے؟

خدا وندا! ترے یہ سادہ دل بندے کہاں جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

درویشی اور سلطانی پر یہ چوٹ حقیقت سے کتنی قریب ہے!

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب، ایک کلیم سربکف

صرف حکمت و دانائی کی باتیں سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زندگی کے معرکے جرات و سرفروشی سے سر ہوتے ہیں۔ ''سر بہ جیب،، اور ''سر بکف،، کی صنعت تضاد نے فنی اور معنوی طور پر شعر کو کس قدر بلند کردیا!

سواد رومتہ الکبری میں دلی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شان دل آویزی

شاعر ''سواد رومتہ الکبری،، کی جگہ ''فضائے رومتہ الکبری،، بھی کہہ سکتا تھا، مگر ''سواد،، نے شعر میں جو شکوہ پیدا کر دیا ''فضا،، سے وہ بات کہاں پیدا ہوتی؟ اقبال کے فن کا یہ پہلو خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے کہ وہ موزوں سے موزوں تر الفاظ انتخاب کرتا ہے۔

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

موتی کی آب ہی تو سب کچھ ہے، یہ جانی رہی تو موتی میں کیا رہا؟ اسی ''آب،، کو اقبال نے خودی سے تشبیہ دیکر اخلاق کا ایک کلیہ وضع کردیا۔

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

ڈبلو، جے کور تھوپ نے شاعری کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی۔۔۔''کہ وہ مسرت آفریں صنعت گری کا نام ہے،، اس شعر میں یہ صنعت کس حسن و زیبائی کیساتھ جھلک رہی ہے!

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

انسانی تاریخ شاھد ہے کہ اسی ''نشہ قوت و اقتدار،، نے صفحۂ ارض کو انسانوں کے خون سے رنگین بنایا ہے، اور ظلم و ستم کے طرح طرح کے روپ دھارے ہیں۔۔۔۔صاحب نظراں، نشہ قوت، اور خطرناک، ان لفظوں کے در و بت نے شعر میں کتنی قوت اور حسن پیدا کر دیا!

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایمان زبان کے ساتھ ساتھ تصدیق قلب کا نام ہے، دل و نگہ اور سیرت و کردار کے مسلمان بننے کے بعد ہی ''لا الہ،، کا اقرار معتبر قرار پایا ہے۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

علم کلام اور منطق و فلسفہ کی کتنی موشگافیاں ہیں جو صدف کے خول سے آگے نہیں بڑھ سکیں، اور گوہر مقصود کو نہیں پا سکیں۔ اقبال نے سامنے کی بات کہی ہے، مگر اس انداز میں کہی ہے کہ وجدان جھومنے لگتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس خاشاک میں ہے

پہلا شعر الہام ہے اور دوسرا شعر پیغام ہے! ''شرر زندہ،، نے شعر کو اور زیادہ گرما دیا اور چمکا بھی دیا—

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرد ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

الفاظ کی نشست سے لیکر معنویت تک اعجاز ہی اعجاز!

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

مغرب زدگی، اشتراکیت زدگی اور بے حیائی کے اس دور میں یہ شعر سچ مچ نوائے سروش ہے!

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریامیں، دریاکی ہے گہرائی

جس دریا کے ہر قطرہ میں دریا کی گہرائی ہو، تو خود وہ دریا کسقدر گہرا ہوگا! اس قسم کا ''بیان،، اقبال کے ''اولیات،، میں شامل ہے! قطرہ کو وسعت کے اعتبار سے دریا تو کہا گیا ہے مگر قطرہ کو دریا کے برابر گہرا کسی نے نہیں کہا—

پلادے مجھے بادۂ پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز

''بادۂ پردہ سوز،، نے ذہنوں میں اس شراب کا جسے ''ام الخبائث،، کہا گیا ہے، خطرہ تک نہیں آنے دیا۔ مصرعہ ثانی زبان و روزمرہ کے اعتبار سے کسقدر سلیس و رواں ہے اور ساتھ ہی شگفتہ بھی!

اٹھا ساقیا! پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

''ممولے،، نے، شعر کی ندرت و نزاکت میں اور پر لگا دئے!

گیا، دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

''مداری،،——یہ لفظ نظیر اکبر آبادی کے کام کا تھا، مگر اقبال نے جس مقام پر اس لفظ کو استعمال کیا ہے، اس کے سبب یہ شعر عوامی بلکہ غیر فانی بن گیا—— ممولا، مداری، پاپی، شکتی جیسے ہندی لفظوں کو اقبال نے جس قدر موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے، اس نے اس کے فن میں بڑا تنوع پیدا کر دیا ہے—

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

جو کوئی اقبال کی زبان پر طنز کرتا ہے، ایسے کور ذوق اور بے رحم و غلط اندیش نقاد کو اقبال کے اس قسم کے شعر چیلنج کرتے ہیں کہ فکر و تخیل کی معراج کیساتھ، اقبال کے یہاں زبان کا لطف بھی ملتا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اس شعر کی روشنی میں مسلمان اپنے احوال کا جائزہ لے کر دیکھیں اور توبہ و انابت کے بعد احتیاطاً تجدید ایمان کرلیں—

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

فارسی کے مشہور مصرعہ——کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند——سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اقبال نے دور حاضر کے نہ جانے کس کس صاحب اقتدار کی ''سلطانی و خواجگی،، کو بے نقاب کر دیا!

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے

منکرین خُدا کے دماغ و عقل اور فہم و بصیرت پر یہ شعر کتنی سچی اور واقعی طنز ہے!

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

آج کی دنیا میں یہی ہو رہا ہے کہ انسان خلاٗ میں سفر کر چکا ہے اور چاند ستاروں میں پہنچنے کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں، مگر وہ خود اپنی سیرت و کردار کی تعمیر سے غافل ہے!

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحب مازاغ

اقبال کا یہی وہ فن ہے، جہاں وہ تمام شاعروں میں ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ سنجیدہ اور باوقار انداز میں کتنی بڑی بات کہی ہے! اس شعر میں ''صاحب مازاغ،،——یعنی صاحب معراج (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کی تلقین کتنے موثر اور جاذب و حسین انداز میں کی گئی ہے! خیرگی کا تعلق بصارت سے ہے اس کی مناسبت سے ''مازاغ،، (البقر) لایا گیا—

بہتر ہے کہ بیچارے ممولے کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

''حال و مقام،، تصوف کی معروف اصطلاحیں ہیں، ان کو شعر میں سموکر، ممولے اور باز کی زندگی اور حدود پرواز اور فضائے تگ و تاز کے فرق کو واضح کیا اور اس طرح یہ شعر پیغام و فن کا ایک دفتر بن گیا——

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کسطرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

اس شعر کی ساری عمارت اس مرکزی خیال پہ قائم ہے کہ مکتب کے قدیم طریق

تعلیم سے دور حاضر کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا—اس خیال کو اقبال نے ''کبریت،، اور ''بجلی کے چراغ،، کی تشبیہ کے قالب میں ڈھال کر شعر کو کیا سے کیا بنا دیا— کبریت (گندھک) میں کوئی شک نہیں گرمی ہوتی ہے، مگر اس گرمی سے بجلی کا چراغ تو روشن نہیں ہو سکتا!

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

''. . . اشداء علی الکفار رحماء بینہم،، کی تفسیر اس شاعرانہ کمال کیساتھ کی ہے کہ خود اس تفسیر پر الہام کا دھوکا ہوتا ہے! حلقہ یاراں ''مقام بزم،، ہے، اس کے لئے ''بریشم،، کا لفظ لایا گیا، رزم حق و باطل میں تیغ و سناں کی ضرورت پڑتی ہے، اس کی ترجمانی ''فولاد،، سے کی گئی!

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

''کنجشک و حمام،، اور ''جبریل و سرافیل،، کی تشبیہات اقبال کے آرٹ کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ کس اچھوتے انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ مرد مومن معمولی باتوں اور سطحی مسئلوں میں نہیں الجھتا، اور کبوتروں اور چڑیوں کا شکار نہیں کرتا۔ وہ تو ''جبریل و سرافیل،، کا صیاد ہے، یعنی زندگی کے اہم اور معرکہ آرا مسائل اس کی تگ و تاز کا موضوع ہیں۔ اس کی نگاہ چڑیوں کے گھونسلوں پر نہیں ہے، وہ تو فاتح، خیبر شکن اور قلعہ کشا ہے—

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفاں
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

نظامی عروضی سمرقندی نے شعر کو ایسی صنعت سے تعبیر کیا ہے، جس کی بدولت موہومات کی ترتیب سے چھوٹی چیز کو بڑا اور زشت کو خوب ثابت کیا جا سکتا ہے—مگر اقبال کے صرف یہ دو شعر نظامی سمرقندی کی اس رائے کی تردید کر رہے ہیں! ان شعروں میں اقبال نے موہومات اور مفروضات سے نہیں

بلکہ حقایق سے کام لیا ہے! مرد مومن کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ مظلوموں اور پریشاں حالوں کے زخموں پر مرہم رکھتا اور تشنہ کاموں کے دلوں کو ٹھنڈک پہونچاتا ہے، مگر ظالموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں اس کی یہ نرمی، درشتی، سخت گیری اور ہیبت سے بدل جاتی ہے۔ ان لوگوں کے دل اس کا نام سن کر دہل جاتے ہیں—

دوسرے شعر میں سورۂ رحمٰن کے آہنگ سے جو مرد مومن کی تشبیہ دی گئی ہے، اس کی معنویت، جزالت اور نغمگی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں اقبال یہ محسوس کرتا ہے :—

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

شعرا' تو لفظوں کے بت تراشتے ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کریں ، مگر اقبال نہ بت گر ہے اور نہ صنم پرست ہے—

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی، بت گری مقصود نیست

''صبح،، کے موضوع پر ہر زبان میں نظمیں کہی گئی ہیں۔ یہ موضوع جس قدر نرم و نازک ہے، اسی قدر حیات بخش اور انبساط آفریں بھی ہے! اقبال نے ایک شعر میں ''پیام،، بھی دیا، اور اس پیام میں صبح کی تعریف بھی بیان کردی :—

مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے

''سورج کی کرن،، پر ایک شعر :—

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب

کہا، اور شعر کو سچ مچ سحر حلال بنا دیا—اس قسم کے شعر گواہی دے

رہے ہیں کہ اقبال کا جمالیاتی ذوق نفیس ہی نہیں پاکیزہ بھی ہے!

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے معرکہ شوق نہ ہو طے

لفظوں کے آہنگ سے تابندگی کیساتھ نغمگی بھی پیدا ہو رہی ہے—

تاریک ہے افرنگ، مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادئ ایمن نہیں شایان تجلی

یہ شعر سائنس کے صنعتی دور پر کتنی چبھتی ہوئی طنز ہے کہ افرنگ کو ''وادئ ایمن،، کہا، مگر ایسی وادی جہاں ''تجلی،، حق کا ظہور نہیں ہو سکتا—

ممکن نہیں تخلیق خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

''شعلہ نم خوردہ،، اور پھر ''ٹوٹے گا شرر کیا،، ان سے شعر ترکیب پاکر کتنا حسین، جاندار اور اثر انگیز بن گیا—

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

''ترش ابرو،، کی ترکیب اردو شاعری میں غالباً پہلی بار استعمال ہوئی ہے! اقبال کا یہی آرٹ ہے جو حسین و نادر ترکیب و تشبیہ کے سہارے لفظ و معنی کا ایک قصر کھڑا کر دیتا ہے—

ستارہ صبح کا روتا تھا اور کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی

چوتھا مصرعہ حباب کے مانند نازک، اور شرارے کی طرح تابناک ہے!

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

تلوار کی شاعروں نے کیسی کیسی تعریفیں کی ہیں، خاص طور سے انیس و دبیر کی شاعری کا تو ''تلوار،، خاص موضوع ہے، مگر اقبال نے تلواروں میں جو بجلیوں کے آشیانے دکھائے ہیں، یہ تشبیہ کسی شاعر کو نہیں سوجھی:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے! مصرعہ ثانی شاعری کا معجزہ ہے—

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اقبال کی نظم ''گورستان شاہی،، کا یہ ایک شعر ہے! جن بادشاہوں کی تدبیر جہاں بانی سے زوال ڈرتا ہو ان کا پیوند خاک ہو جانا، کسقدر عبرت انگیز ہے—

اسی نظم کا ایک اور شعر ہے۔

دھر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اس گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

اس دور کے مسلمانوں کو گزرے ہوئے طوفانوں کے ''آخری بادل،، کہہ کر شاعر مشرق اور حکیم ملت نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر کھینچ دی—

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدھن ہے مجھ کو

''خاکم بدھن،، کا شعر و ادب میں شاید ہی کہیں اس قدر بر محل استعمال ہوا ہو—

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی آن دیکھے خدا کو کیونکر

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

''شکوہ،، علامہ اقبال کے ابتدائی دور کی نظم ہے مگر یہ نظم ان کے پیام و فن کا شاہکار ہے۔ اس نظم نے اردو شاعری میں سنگ میل قائم کر دیا۔ اسے سنکر لوگ چونک پڑے کہ یہ تو آہنگ ہی عجیب ہے! ''مسدس حالی،، کے ہوتے ہوئے ''شکوہ،، کا مقبول ہونا، اقبال کے فن کی اقبالمندی کی دلیل تھی! ابھی ابھی جو چند شعر پیش کئے گئے ہیں وہ اسی سلک مروارید کے چند جواہر ہیں، جن کی تابناکی کو زمانہ کا کوئی انقلاب دھندلا نہیں سکتا!

''عین،، عربی لفظ ہے، اس لئے لفظی تناسب و آہنگ قائم رکھنے کے لئے عربی یا فارسی کا کوئی لفظ اس (عین) کیساتھ آنا چاہئے تھا،،—اس طرح— ''عین معرکہ آرائی میں،، یا ''عین ہنگام جدال و قتال،، مگر اقبال نے ''لڑائی،، ٹھیٹ اردو لفظ استعمال کیا، اور اس نے ''عین،، کے ساتھ مربوط ہوکر، شعر میں بے پناہ قوت پیدا کردی۔ لفظوں کے بر محل استعمال اور صحیح انتخاب نے اقبال کے فن کو مثالی آرٹ بنا دیا ہے!

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں

پیام، تخیل، اظہار اور شاعرانہ فن کاری، ہر چیز خوب سے خوب تر! اور رہی تاثیر، تو وہ اس شعر میں برق تپاں بن کر دوڑ رہی ہے—

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تونے
ہم سخن کر دیا بندے کو خدا سے تونے

''شکوہ،،—میں ''خاکم بدھن،، جس موزونیت کیساتھ نظم ہوا تھا، ''جواب شکوہ،، میں ''حسن ادا،، نے اس توازن اور آہنگ کو قائم رکھا—''شکر شکوے کو کیا،، ان لفظوں کی بلاغت کا کیا کہنا!

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

دوسرے مصرعہ کی تدریجی ترقی کس قدر وجد آفریں ہے—

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

اس شعر میں اقبال نے ''نشہ،، کو غیر مشددشین کیساتھ بروزن ''پردا،، نہیں، بلکہ بروزن ''وفا،، نظم کیا ہے، اور یہی اہل زبان کا روز مرہ اور لب و لہجہ ہے! شعر میں لفظوں کا در و بست (Construction) ایسا ہے کہ پڑھنے میں زبان حلاوت محسوس کرتی ہے—

اس چمن میں پیرو بلبل ہو، یا تلمیذ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر

''تلمیذ گل،، اردو زبان میں کتنا رنگین و حسین اضافہ ہے! میں نے ایک شعر کہا تھا :—

سراپا شوق بن، یا بے نیاز آرزو ہوجا
جہان عاشقی میں یوسفی کر یا زلیخائی

مگر اقبال کے اس شعر کو پڑھ کر میرا زعم اولیت و تقدم جاتا رہا—

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جسطرح سونے کو کردیتا ہے گاز

مغرب زدگی کے اثر سے ملت بیضا کی جو حالت ہوئی ہے، اس کے لئے :

''ٹکڑے ٹکڑے جسطرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

کی مثال لاکر حقیقت کا کس دقت نظر اور فن کارانہ نزاکت کیساتھ تجزیہ کیا ہے!

براهیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینہ میں چھپ چھپ کر بنالیتی ہے تصویریں

غالب نے تو صریر خامہ کو نوائے سروش یوں ہی شاعرانہ رسمی تعلی کے طور پر کہہ دیا تھا، مگر اقبال نے جب یہ شعر کاغذ پر لکھا ہوگا، تو اس کے صریر خامہ سے سچ مچ نوائے سروش پیدا ہوئی ہوگی—

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرہ کا دل چیریں

یہ وہ انداز بیان اور شاعرانہ آرٹ ہے، جو ان لوگوں کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے، جن کو سخن سنجی، سخن گوئی اور فنکاری کا دعوی ہوتا ہے، اور جو دوسرے شاعروں کے فن سے مرعوب نہیں ہوتے—

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوق شکرخند

مرکزی خیال یہ تھا کہ شاعر کا دل ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ مگر اقبال نے اس خیال کو غنچہ کے ذوق شکر خند کی تشبیہ کے ساتھ، جس انداز سے بیان کیا ہے، اس نے ایک عالم مستی و سرخوشی اور فضائے خود داری و بے نیازی پیدا کردی—

''صدیق،، جس نظم کا عنوان ہے، اس کا یہ شعر—

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

کتنا ''ڈرامائی،، ہے! یہیں سے نظم کے Climax کا آغاز ہوتا ہے!

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

فلسفہ خودی کا یہ مبلغ بلکہ یوں کہئے 'موجد و مخترع، اس کا احساس رکھتا

تھا کہ اس کے پیغام اور فن کا کیا مقام ہے، اس نے شعر سے کیا کام لیا ہے! مغرب زدگی، مادہ پرستی، ملائیت اور سلطانی و پیری یہ سب اس کا ہدف ہیں، اسی لئے ان کے علمبردار اس سے خفا ہیں اور اسے برداشت نہیں کر سکتے!

چمن ہے، غزل سرائی ہے، شاعر کا نفس ہے، لالہ کی آگ ہے، ان لفظوں نے تخئیل کو کس دلکش پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ اس سے زیادہ دل کشی کا تصور نہیں کیا جا سکتا!

اقبال کے فن کی مشکلات اقبال کے فن کے بارے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ اس نے نشاط و شرخوشی کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا، کہ لوگوں کے دل اس سے بہلیں، رقص و سرود کی محفلوں میں اس کے کلام سے گرمی پیدا ہو، عاشقانہ خط و کتابت میں اس کے شعر استعمال کئے جائیں اور اس کے شعر پڑھ پڑھ کر لوگ شرابیں پئیں، کھیلیں کودیں، ناچیں اور خوش فعلیاں کریں—

اقبال نے شاعری کی اس روش عام کو چھوڑ کر سچ تو یہ ہے کہ بڑا خطرہ مول لیا۔ خطرہ اس کا کہ لوگ نشاط و سرخوشی کی شاعری کے عادی ہو چکے ہیں، ان کی عادت، ذوق اور مزاج و طبیعت کے تقاضوں سے ہٹ کر شعر کہے جائیں گے، تو قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس شاعر کی شاعری کو قبول عام حاصل نہ ہو، اس کی شخصیت مجہول بن کر رہ جاتی ہے—

مناظر فطرت پر، انسانی حسن جمال پر، شراب و رقص اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر شعر کہنا اس لئے آسان ہے کہ ہر زبان کے شعر و ادب میں ہزاروں نمونے پہلے سے موجود ہیں۔ پھر یہ موضوعات رنگین ہیں، اس لئے پیرایہ بیان اور طرز ادا میں رنگینی کی ''لے،، آخر تک قائم رہتی ہے، اور اس طرح غزل ہو یا نظم ان میں رنگینی اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہی چیزیں شاعری کی جان ہیں—

''حسن و عشق،، کے موضوع پر شعر کہنے میں شاعروں کو سہولت بلکہ یوں کہئے کہ ''چھوٹ،، ملتی ہے، اس میدان میں ان پر کوئی قید اور پابندی نہیں۔ انتہائی ثقہ اور مہذب و سنجیدہ شاعروں نے جن کے ناموں کیساتھ حضرت اور رحمت اللہ علیہ لکھا جاتا ہے، وصل و اختلاط کی باتیں جب

بیان کی ہیں تو وہ ضرورت سے زیادہ بے باک ہو گئے ہیں—

اقبال نے جس پیغام کو موضوع سخن بنایا، شاعری میں اس کے چند نمونے تو ضرور پائے جاتے تھے۔ مگر کوئی مثالی نمونہ، مکمل نقش اور واضح شاہراہ موجود نہ تھی۔ اقبال کو اپنی منزل خود بنانی پڑی۔ اس کے پیغام نے اسلام و اخلاق کی جسطرح کھل کر بلکہ یوں کہئے کہ فیصلہ کن انداز میں ترجمانی کی ہے، اس کا نمونہ پہلے کہیں نہیں ملتا! اس سے اقبال کے پیغام و فن کی مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے سچ مچ شعر میں خون جگر حل کرنا پڑا ہے، تب کہیں جا کر یہ خاکے اور مرقعے دل کش و رنگین اور جاذب نظر بن سکے ہیں—

نوجوانوں کو نظارہ بازی اور ہوسناکی کے چٹخاروں کے لئے ابھارنا آسان ہے۔ یہ موضوع خود نہایت رنگین اور چٹخارے دار ہے۔ شعر کہنے کا سلیقہ ہو تو نہایت ہی رنگین اور طربناک غزل یا نظم تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن جو شاعر نوجوانوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہو—

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

اس کی دشواریوں اور جگر کاویوں کا کیا پوچھنا!

اقبال کی فکر ایک خالص دیندار کی فکر ہے، جس کی نگہ میں رقص و موسیقی، عورتوں کی بے حجابی، یہاں تک کہ سینما، مجسمہ سازی اور تصویر کشی تک نا پسندیدہ ہیں۔ مگر اقبال کے فن کا یہ کمال ہے کہ اس نے اخلاق و پاکبازی کا درس دیا اور زمانہ کے غلط تقاضوں کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر وہ چیز جسے ''شعریت،، کہتے ہیں، پھیکی نہیں ہوئی، بلکہ اس کا رنگ اور زیادہ نکھر گیا—

اقبال نے بے شک اخلاق کا وعظ کہا، مگر واعظوں کے لہجہ میں نہیں، اس کا لہجہ خالص شاعرانہ ہے۔ شعر و سخن کے تمام محاسن اسکے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ وعظ و تلقین کو اقبال نے شعریت کے قالب میں ڈھال کر اپنے پیغام کو اسقدر حسین و جمیل اور دلچسپ بنا دیا ہے کہ مغرب زدوں کے جس طبقہ پر اقبال طنز کرتا ہے، خود یہ طبقہ اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے!

''حق،، تلخ اور بے مزہ ہوا کرتا ہے، مگر اقبال کے فن کا یہ کمال ہے کہ اس کے کلام میں حق کی یہ تلخی اور بد مزگی حلاوت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اس کے فن نے ایلوے کو شہد اور حنظل کو نبات و قند بنادیا ہے۔

اقبال کا فن دنیا کے اس عظیم ترین شاعر کا فن ہے کہ۔

جہاں سب ہیں وہاں بھی ہے وہ موجود
جہاں وہ ہے، وہاں کوئی نہیں ہے (م۔ق)